غلط فہمیاں اور خام خیالیاں

مسلمانوں کے سامنے "آزادی" کا نام لے کر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دلفریب نام کو سُن کر بے خود ہو جائینگے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہر اُس راستے پر چل کھڑے ہونگے جسے "آزادی کا راستہ" کہہ دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی آزادی کے اتنے ہی خواہشمند ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے لوگ، بلکہ مسلمانوں میں اس چیز کی تڑپ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کیلیے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہو۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن جمہور مسلمین میں شائد کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ اوسطاً ایک مسلمان دوسری تمام قوموں کی بہ نسبت انگریزیت اور اس کے اقتدار کو زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا مذہب ہی اسے یہ سکھاتا ہے کہ مادّہ پرستی، شہوات کی بندگی اور ظلم و جور پر جس تہذیب اور جس سیاست کی بنا قائم ہو اس سے نفرت کرے۔ پھر اس کے دل میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس ملک کی حکومت اُسی سے چھینی گئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا ہے، اسلیے نہ صرف فطرۃً، بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادی وطن کا خواہشمند ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آزادی وطن سے مراد کیا ہے؟ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی

ہے ؟ یہ چیز فی نفسہٖ مطلوب ہے، یا کسی غرض کیلیے ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے ؟ اگر وہ غرض حاصل ہونے کے بجائے الٹی فوت ہوئی جاتی ہو تو کیا پھر بھی کسی قوم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ "آزادی" کے نام پر دیوانہ وار دوڑی چلی آئیگی ؟ کیا ایسی "آزادی" کو وہ قوم بھی اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہے جس کو حقیقت میں آزادی نہ مل رہی ہو ؟ اور کیا اس قسم کی آزادی کیلیے جنگ اور قربانی کرنا عقل، فطرت، دین کسی چیز کی رو سے بھی کسی قوم کا فرض ہوسکتا ہے ؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر میدان جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر ذی عقل انسان غور کرنے پر مجبور ہے، اور مسلمان آخر ذوی العقول سے خارج تو نہیں ہے کہ ان بنیادی سوالات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ اُس بگل کی آواز پر لفٹ رائٹ شروع کردے جو شیوگاؤں یا سوراج بھون سے پھونکا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ "آزادی وطن" سے مراد ہمالہ اور گنگا وجمنا اور مشرقی و مغربی گھاٹوں کی آزادی نہیں ہے۔ یہ پہاڑ اور یہ دریا دس ہزار برس پہلے جیسے آزاد تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور قیامت تک رہینگے۔ دراصل غلام یہ پہاڑ اور یہ دریا نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کے باشندے ہیں، اور آزادی وطن سے مراد حقیقت میں وطن کے باشندوں ہی کی آزادی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وطن جب ۳۵ کروڑ باشندوں سے آباد ہے تو صحیح معنوں میں "آزادی وطن" صرف اُسی آزادی کو کہا جاسکتا ہے جو ان پورے ۳۵ کروڑ باشندوں کے لیے آزادی ہو۔ اہل وطن میں سے بعض کی آزادی اور بعض کی غلامی کو پورے وطن کی آزادی سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ عموماً لوگ محض سہولت پسندی کی بنا پر بہت سے ایسے ملکوں کو "آزاد" کہہ دیا کرتے ہیں جنکے باشندوں کا ایک حصہ آزاد اور دوسرا حصہ خود اپنے

اہلِ وطن کا غلام ہوتا ہے۔ مثلاً جس دور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان[1] آزاد تھا اس میں درحقیقت "ہندوستان" آزاد نہ تھا بلکہ صرف ہندوستان کا آریہ آزاد تھا۔ شودر کی غلامی اُس ملک کے باشندوں کی غلامی سے ہزار درجہ زیادہ بدتر تھی جسے اصطلاحاً ہم غلام کہتے ہیں آج امریکہ کو آزاد ملک کہا جاتا ہے، حالانکہ امریکہ کی آزادی محض اسکے سفید فام باشندوں کی آزادی ہے، سیاہ فام باشندے کسی آزادی سے متمتع نہیں۔ اسی طرح روس کی آزادی صرف اس کے کمیونسٹ باشندوں تک محدود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور تمام غیر اشتراکی بلکہ غیر اسٹالینی باشندوں کے لیے قطعاً کوئی آزادی نہیں، بلکہ ہماری غلامی سے بھی بدتر غلامی ہے۔ جنوبی افریقہ کی آزادی محض اسکے فرنگی باشندوں کے حصہ میں آئی ہے۔ وہاں کی دیسی آبادی اور ہندوستانی آبادی اس درجہ غلام ہے کہ ہم اپنے آپ کو نسبتہً ان کے مقابلہ میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی کی آزادی صرف آرین نسل کیلیے ہے۔ سامیوں کیلیے نہیں۔ چیکوسلوواکیا کی آزادی چند روز پہلے تک صرف چیک اور سلاوک باشندوں کیلیے مخصوص تھی دوسروں کے لیے نہیں۔ ایسے ممالک کو اگر عرف عام میں آزاد کہا جاتا ہے تو اس سے وہ تلخ حقیقت شیرینی نہیں بن جاتی جو اُن کے غلام باشندوں کو رات دن زہر کے گھونٹوں کی طرح حلق کے نیچے اتارنی پڑتی ہے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ محض غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو جانے کا نام "آزادی" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ آزادی کی تمام حقیقت نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا مقدمہ ہے۔ آزادی کا اصلی جوہر تو حکومت خود اختیاری سے متمتع ہونا اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔ یہ چیز اگر ملک کے کسی گروہ کو حاصل نہ ہو، اگر اسکی تکمیل اپنے ہی وطن کے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ میں رہے کہ جس طرح وہ چاہے اسے اٹھائے اور بٹھائے

اور جس طرف چاہے اسے چلائے جائے اور جو کچھ چاہے اس پر لاد دے، تو وہ حقیقت میں غلام ہی ہوگا۔ اسکے لیے ملک کی آزادی محض بے معنی ہوگی۔ غلامی اپنی حقیقت اور فطرت کے لحاظ سے بہر حال ایک ہی چیز ہے۔ اُس میں اس لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک والوں کی غلامی ہے یا اہلِ وطن کی۔ اگرچہ تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ کمیت وکیفیت کے اعتبار سے اہلِ وطن کی غلامی بہ نسبت غیر ملکیوں کی غلامی کے زیادہ شدید ہوتی ہے، مثلاً جو سلوک امریکہ کا سفید فام اپنے حبشی اہلِ وطن کے ساتھ کرتا ہے، یا جو برتاؤ روس کا استالینی اپنے غیر اسٹالینی یا غیر اشتراکی اہلِ وطن سے کررہا ہے، اسکو کوئی نسبت اُس طرزِ عمل سے نہیں جو ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا ہے، تاہم دونوں قسم کی غلامیوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ غلامی بہر حال ایسی چیز ہے کہ اسے دفع کرنے کی کوشش ہی کرنی چاہیے۔ پس جو شخص اہلِ وطن کی غلامی کو غیر ملکیوں کی غلامی پر ترجیح دیتا ہو، اور دوسری قسم کی غلامی کو محض پہلی قسم کی غلامی میں بدل لینے کا نام "جنگِ آزادی" رکھے، اور ایسی جنگ آزادی میں شریک ہونے کو فرض قرار دے وہ دراصل جنت الحمقار کا باشندہ ہے۔ کوئی صاحب عقل انسان اسکی پیروی نہیں کرسکتا۔ نہ ایک پوری کی پوری قوم اتنی بے وقوف ہوسکتی ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کیلیے میدانِ جنگ میں کود پڑے، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھے کہ آزادی کے اصلی جوہر میں بھی اس کا کوئی حصہ ہے یا نہیں۔

ایک وطن کے باشندوں کو مجرد اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں، تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا، اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کیلیے یکساں آزادی قرار دینا، یا تو جہالت ہے یا پھر خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اسی

مفروضہ کو سامنے رکھ کر بے تکلف کہہ جاتے ہیں کہ "بھائی! جب ملک آزاد ہوگا تو سب آزاد ہو جائینگے"۔ لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں ہر جگہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاں صرف ایک قوم رہتی ہو مختلف گروہ اور اُن گروہوں کے درمیان گروہی امتیازات نہ ہوں، اور سب باشندے اپنے عقائد، جذبات و احساسات (Sentiments) رسوم و رواج، قوانینِ معاشرت اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے ایک ہوں، یا کم از کم باہم متقارب ہوں، وہاں تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محض ملک کا آزاد ہو جانا ہی تمام باشندگانِ ملک کا آزاد ہو جانا ہے، کیونکہ وہاں اہل ملک میں الگ الگ گروہوں کا وجود ہی نہیں ہے جسکی بنا پر اس امر کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ آزادی ایک گروہ کے پاس الگ کر رہ جائے اور دوسرے گروہ تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ یا زبان یا عقائد، جذبات اور طرزِ زندگی کے بیّن اختلافات موجود ہوں، وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اُچک لے اور دوسرے گروہ یا گروہوں کو اس سے محروم کردے۔ ایسی جگہ وہ مفروضہ نہیں چل سکتا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر گروہ کو یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے وجود کو عزیز رکھتا ہے تو اسے پوچھنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنیکا کونسا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، اور جس آزادی کیلیے جدوجہد کی جا رہی ہے وہ کس نوع کی آزادی ہے۔ پھر اگر واقعات سے کسی گروہ پر یہ ثابت ہو جائے کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو اُس کے اجتماعی وجود کو نقصان پہنچانے والا ہے، اور ملک کی آئندہ حکومت ایسے اصولوں پر تعمیر ہو رہی ہے جنکی بدولت حکمرانی کے اختیارات سے وہ لازمی طور پر محروم ہو جاتا ہے تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی جنگ آزادی میں حصہ لیگا۔ ایسی آزادی کو ملک کی آزادی کہنا ہی حقیقت کے خلاف ہے۔ جس گروہ کیلیے یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی

ہے ، اور جس گروہ کیلیے یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے وہ آخر کیوں اسکے حاصل کرنے میں حصہ لے ؟

اس مرحلے پر پہنچ کر ہم سے مختلف باتیں کہی جاتی ہیں ، اور ضرورت ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں ۔

کہا جاتا ہے کہ ملک کی آزادی کا لازمی نتیجہ ملک کی خوشحالی ہے ، اور یہ خوشحالی جب آئیگی تو تمام باشندے اس سے متمتع ہونگے ۔ تعلیم عام ہوگی ، تمدن ترقی کریگا ، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہوگا ، معیار زندگی بلند ہوگا ، اور اقوام عالم کے درمیان اہلِ ملک کی عزت بڑھیگی ۔ یہ فوائد ظاہر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کو حاصل ہونگے ۔ پھر کیوں نہ ملک کے ہر گروہ کو ان فوائد سے یکساں دلچسپی ہو اور کیوں نہ وہ اسکے حصول کیلیے مل کر جدوجہد کریں ؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کی خوشحالی اور ترقی کیلیے آزادی ناگزیر ہے ، اور آزادی کے حصول میں مختلف گروہوں کا وجود اور اسکے امتیازات مانع ہیں ، لہذا کوشش کرنی چاہیے کہ ان گروہوں کو اور ان کے امتیازات کو مٹا کر تمام اہلِ ملک کو ایک کر دیا جائے ۔ کیونکہ جب تک یہ باقی رہینگے ملک آزاد نہ ہو سکے گا ، اور جب تک ملک آزاد نہ ہوگا ، تمام اہلِ ملک ، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں ، یکساں بدحالی ، افلاس ، جہالت ، اخلاقی اور ذہنی پستی میں مبتلا رہینگے ۔ کیا تم ان حالات کو دائماً برقرار رکھنا چاہتے ہو ؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کے باشندوں میں عقائد ، جذبات ، طرز زندگی ، زبان ، ادب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات غیر حقیقی اور مصنوعی ہیں ۔ ان کو زندگی کے اہم تر مسائل سے کوئی علاقہ نہیں ۔ زندگی کے اہم تر مسائل یہ ہیں کہ لوگوں کو کھانے کیلیے مل رہا ہے یا نہیں ؟ اُن کیلیے زندگی کی ضروریات پوری کرنے ، اور مزید برآں زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے

کے مواقع موجود ہیں یا نہیں؟ ان کے ملک میں دولت آفرینی کے جو وسائل موجود ہیں ان سے کس قدر فائدہ اٹھایا جا رہا ہے؟ اور جو دولت وہ پیدا کر رہے ہیں وہ کس طرح تقسیم ہو رہی ہے؟ ان اہم تر مسائل کا تعلق تمام باشندگان ملک سے یکساں ہے اور ان میں اُن سطحی اختلافات کا کچھ دخل نہیں جنکا تم ذکر کرتے ہو۔ لہذا یہ اختلافات اگر موجود بھی ہیں تو انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے اور تمام باشندگان ملک کو ایک قوم فرض کر کے زندگی کے ان مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بقاو قیام اور عروج و ارتقار کا انحصار بھی معاشی فلاح اور سیاسی آزادی پر ہے۔ یہ چیز اگر حاصل نہ ہو تو کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، کجا کہ ترقی کر سکے۔ لہذا تہذیب و تمدن کا مفاد بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ ملک کے تمام گروہ مل کر پہلے سیاسی آزادی اور معاشی فلاح کے لیے جدوجہد کریں۔

یہ مختلف باتیں کبھی مختلف زبانوں سے اور کبھی ایک ہی زبان سے سُننے میں آتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ہم کو دھوکا دینے کے لیے نہیں کہی جا رہی ہیں تو ان کے کہنے والے خود دھوکے میں ہیں۔ وہ حقیقت کو طالب علم کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ مشنری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی خواہشِ نفس کے اتباع میں گم ہو جاتا ہے۔

آج انسان اُس دور سے ہزاروں برس آگے نکل چکا ہے جس دور میں وہ محض ایک جانور ہونے کی حیثیت سے بس اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا تھا، اور یہ امر اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا کہ یہ ضروریات کس ڈھنگ پر کس صورت میں پوری ہوتی ہیں۔ اب اسکے لیے اپنی ہزار ہا برس کی طے کی ہوئی مسافت کو اُلٹے پاؤں دوبارہ طے کرنا اور یکایک اُسی دورِ وحشت و حیوانیت کی طرف پس پا ہو جانا محال ہے۔ اس طویل مدت

ہیں اس کی عقل، اسکے مذاق، اسکے علم اور اسکی قوتِ اجتہاد و اکتساب کے ارتقار سے انسانیت کے مختلف نمونے (Models) پیدا ہو چکے ہیں - ایک ایک قوم ایک ایک نمونے کو پسند کرکے اُس پر اپنی اجتماعی شخصیت تعمیر کر چکی ہے اور اُس خاص نمونۂ انسانیت کو اپنی قومی ہیئت (National type) بنا چکی ہے جو صدیوں کے نشوونما سے اس کے اندر پختہ ہوا ہے - اب ایک قوم کی زندگی دراصل اسکے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اسکے نیشنل ٹائپ کا مرجانا خود اس قوم کا مرجانا ہے - اگرچہ ضروریات زندگی کا پورا ہونا، دولت حاصل کرنا اور اسے خرچ کرنا آج بھی ہر قوم کیلیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت آج سے دس ہزار برس پہلے رکھتا تھا - لیکن ان تمام معاملات کا دامن ہر قوم کے مخصوص نظریۂ زندگی، اسکے ضابطۂ اخلاق، اسکے اصول معاشرت و تمدن، اور اس کے معیار قدر و قیمت کے ساتھ بندھا ہوا ہے - ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے ہی نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے - آپ محض "ضروریات زندگی" کا نام لے کر کسی قوم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ انکے حصول کے لالچ میں وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو تبدیل کردے، کیونکہ اسکی تبدیلی دراصل قوم کی موت ہے - کوئی قوم جسکی قومی سیرت مستحکم ہو چکی ہو وہ محض آسائشوں کے لالچ سے اپنے نیشنل ٹائپ کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی - اور جو قوم اس پر آمادہ ہو جائے اسکے متعلق یہ یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے کہ یا تو اس کا کیرکٹر ابھی بنا نہیں ہے، یا پھر وہ ایک ذلیل اور موقع طلب (Opportunist) قوم ہے جس کی سیرت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا -

اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کیجیے کہ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنے نیشنل

ٹائپ کی حفاظت اور اسکے نشوو ارتقاء کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبدا ہے - جو قوم غلام ہوتی ہے وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو صرف یہی نہیں کہ ترقی نہیں دے سکتی، بلکہ اسکے برعکس اس کا نیشنل ٹائپ مضمحل ہوتا جاتا ہے - اگر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ عزیز نہ ہو تو اس میں سرے سے آزادی کی خواہش پیدا ہی نہ ہوگی - اور جس قوم میں آزادی کیلیے تڑپ پائی جاتی ہے، اسکی اس تڑپ کا کوئی سبب اسکے سوا نہیں کہ وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو عزیز رکھتی ہے، اسے فنا نہیں ہونے دینا چاہتی، اور اس کو ترقی دینے کی خواہشمند ہے -

جب حقیقت یہ ہے تو وہ صرف ایک جاہل اور بے وقوف آدمی ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کی خاطر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ بدل دینے کے لیے کہیگا - اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی خاطر آزادی کی خواہش ایک قوم میں پیدا ہوا کرتی ہے، اسی چیز کو مٹانے کا خیال ظاہر کیا جائے اور پھر یہ توقع رکھی جائے کہ آزادی کی پکار اس قوم کے دل و دماغ کو اپیل کریگی - کیا کوئی شخص مرنے کے لیے غذا کھا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص نقصان اٹھانے کی نیت سے تجارت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس غرض کے لیے پانی کی طرف دوڑ سکتا ہے کہ اسکی پیاس بجھنے کے بجائے اس کا سینہ جل جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک قوم اپنے قومی وجود کو ختم کرنے کیلیے آزادی کی خواہش کرے حالانکہ آزادی اسکی مطلوب ہی صرف اسلیے ہو سکتی ہے کہ اپنے قومی وجود کو زندہ رکھے اور ترقی دے -

بلاشبہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائے - لیکن اسکے ساتھ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جس ملک میں متعدد قومیں مختلف قومی ہیئتوں کے ساتھ رہتی ہوں، وہاں مجرد ملک کی آزادی کو ہر ہر قوم کی آزادی نہیں کہا جا سکتا - وہاں آپ کو صراحت کے ساتھ یہ بتانا پڑیگا

کہ آزاد حکومت کی نوعیت کیا ہوگی۔ اگر آزاد حکومت کیلیے آپ کے پاس خالص جمہوریت کے اصول ہوں جنکے معنی اکثریت کی حکومت کے ہیں، تو لامحالہ یہ آنے والی آزادی صرف اس قوم کیلیے آزادی ہوگی جو کثیر التعداد واقع ہوئی ہو۔ قلیل التعداد قوموں کیلیے اس کے معنی بجز اسکے کچھ نہ ہونگے کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے نکل کر خود اپنی ایک ہم وطن قوم کی تابع ہوجائے۔ ایسی آزادی کو نہ تو قلیل التعداد قومیں اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہیں اور نہ یہ توقع کرسکتی ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے تحت رہ کر انہیں اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کا کوئی موقع مل سکیگا۔ آزادی کی جنگ میں ان کے لیے صرف اسی وقت کشش پیدا ہوسکتی ہے جب کہ آزاد حکومت کا ایسا نقشہ انکے سامنے پیش کیا جائے جس میں انکے لیے بھی حکومت خود اختیاری رکھی گئی ہو، اسلیے کہ صرف حکومت خود اختیاری ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی کیلیے کچھ کرسکتی ہے، اور نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی ہی وہ واحد غرض ہے جسکے لیے کوئی قوم آزادی چاہتی اور آزادی کی خاطر لڑ سکتی ہے۔

رہا یہ قول کہ ملک کی خوشحالی میں تمام باشندگان ملک کا یکساں حصہ ہوگا، خواہ ملک کا نظام حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہی کیوں نہ ہو، تو یہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں قومی امتیاز موجود ہو وہاں ترجیح ہم جنس لازماً موجود ہوتی ہے، اور جہاں ترجیح ہم جنس پائی جاتی ہو وہاں صرف عقائد، جذبات، طرز زندگی، زبان و ادب اور تہذیب و تمدن ہی کے معاملہ میں ایک قوم کا مفاد دوسری قوم سے مختلف نہیں ہوتا، بلکہ معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی لازماً مختلف ہوجاتا ہے۔ وہاں جس طرح ایک قوم اپنی تعلیم، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کے سوال کو بے خوف و خطر دوسری قوم کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی، اسی طرح وہ اپنی روٹی کے سوال کو بھی اسکے ہاتھ میں دے کر مطمئن نہیں ہوسکتی، اور نہ انتظامی

وتشریعی ادارات میں اپنی نمائندگی کے سوال کو اس پر چھوڑ سکتی ہے۔ جس جگہ ایک شخص پانی پینے اور کھانا کھانے کیلیے بھی یہ دیکھتا ہو کہ پانی لانے والا اور کھانا بیچنے والا اسکا ہم قوم ہے یا نہیں، جہاں ایک شخص بازار میں خرید و فروخت کرتے وقت بھی دوکاندار کی قومیت پر نظر رکھتا ہو، جہاں ایک مزدور سے خدمت لیتے ہوئے، یا کسی آدمی کو ملازم رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھا جاتا ہو کہ اس مزدور یا اس امیدوار کا تعلق کس قوم سے ہے، وہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کے سارے باشندوں کا معاشی یا سیاسی مفاد یکساں ہے، اور کسی ایک قوم کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات سمٹ جانے سے دوسری قوم کے پیٹ کو کوئی خطرہ نہیں۔

پھر جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں، یہ خیال کرنا بھی بالکل غلط ہے کہ دولت آفرینی اور تقسیم دولت اور معیار زندگی کی ترقی اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے مسائل کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے نہیں ہے۔ اس باب میں ہر جماعت اپنا ایک الگ مسلک اور الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے، اور محض آسائش جسمانی کے لالچ سے اس بات پر آمادہ نہیں ہوسکتی کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نظر سے بدل لے۔ آپ اشتراکی جماعت سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے نظریات معیشت و اجتماع کو کسی لالچ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظریات سے بدل لیگی۔ اسی طرح آپ کو ایک مسلمان سے بھی یہ توقع نہ کرنی چاہیے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بدل دیگا، اور اپنے آپ کو دوسروں کے حوالہ کردیگا کہ جس طرح چاہیں اسکے لیے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کے سوال کو حل کردیں، درانحالیکہ یہ سوال اسکی تہذیب و تمدن کے نقشے کو بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لوگ "آزادی" کا لفظ زبان

سے نکال کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس تام کو سنتے ہی ان کی طرف دوڑے چلے آئینگے، اور جب انکی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو مسلمانوں کو بزدلی اور رجعت پسندی اور سامراج پرستی کے طعنے دیتے ہیں، وہ کس قدر خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ہر قوم میں تھوڑے یا بہت افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو اپنے تخیلات واوھام میں گم ہو کر اپنے قومی مفاد کو بھول جاتے ہوں۔ اور ایسے افراد بھی ضرور پائے جاسکتے ہیں جو دن کی روشنی میں بھی نمایاں حقائق کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ مگر ایک پوری کی پوری قوم نہ اندھی ہوسکتی ہے اور نہ بے وقوف۔ وہ کسی آواز پر دوڑنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے گی کہ اس کو کس طرف بلایا جارہا ہے۔ وہ محض آزادی کی پکار پر فریفتہ نہیں ہوسکتی بلکہ عین اسکی عقل اور فطرت کا اقتضا ہے کہ اس پکار کی حقیقت پر غور کرے، اور یہ تحقیق کرے کہ آزادی حاصل کرنے کیلیے کونسا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے، اور یہ پکارنے والے جس آزادی کے لیے جدوجہد کررہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی دو سوالات کی تحقیق کی جائے گی۔